سید عامر سُہیل
پروفیسر، شعبہ اردو و اقبالیات، دی اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور
شہزاد فرید
استاد، شعبہ سوشیالوجی، یونیورسٹی آف اوکاڑہ، اوکاڑہ

اکیسویں صدی کا نظامِ زر اور مجید امجد

Syed Amir Sohail
Professor, Department of Urdu & Iqbaliat, The Islamia University Bahawalpur.
Shahzad Farid
Assistant Professor, Department of Sociology, University of Okara.

Capital in 21st Century and Majeed Amjad

The modern poetry cannot be comprehended without Majeed Amjad –one of the most renowned modern poets of 20th century. Although, plethora of research have conducted on poetic logic, comprehensiveness and dimensionality of his poetry yet some dimensions remained unexplored. This article dealt with the one of those neglected aspects i.e. capital in 21st century and poetry of Majeed Amjad. In the article, we argued that in order to relationally study between a poet and a system, it is important to have two-dimensional comprehensive information: the poet and the system. Therefore, initially we described all possible explanations of capital in 21st century, followed by detailed description of all possible relations between Majeed Amjad's poetry and capital in the 21st century.

Key words: *Capital, Capitalism, Economy, Majeed Amjad, Modern poetry.*

یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ مجید امجد کی شاعری میں نظامِ زر یا تصورِ نظامِ زر کے بارے میں کوئی باقاعدہ تصور یا نظریہ دکھائی نہیں دیتا۔ ایک خالص شاعر سے اس کی توقع بھی نہیں رکھنی چاہئے اور اور نہ ہی یہ اس کا منصب ہے کہ وہ اپنے تخلیقی جوہر کو کسی مخصوص نظریے کی بھینٹ چڑھائے یا ایک خاص زاویہ نظر پر شعری وفور کو قربان کر کے اپنے فکری تناظر کو امکانات کی دنیا سے تہی کر لے تاہم یہ حقیقت ہے کہ اپنی نظریاتی عدم وابستگی کے اعلان اور خود کو کسی تنظیمی دائرے میں محدود نہ کرنے کے باوجود وہ اپنے عہد کے حالات و واقعات سے نہ صرف آگاہ تھے بلکہ اس کا تجزیہ بھی شعری پیرائے میں کرتے رہتے تھے۔ اس عہد کے سیاسی، سماجی، معاشی، تاریخی اور ثقافتی تناظرات میں ترقی پسندی، پاکستانی جدیدیت، لسانی تشکیلات ایسے بہت سے فکری رویے فیشن کا سا درجہ رکھتے تھے تاہم انھوں نے ان فکری تناظرات سے تخلیقی خوشہ چینی تو

ضرور کی مگر خود کو ان کی تنظیمی جکڑ بندویوں سے دور رکھا۔ اس کی بنیادی وجہ ان امکانات تک رسائی ممکن بنانا تھا جو نظم میں فرد کے انفرادی عمل سے کائناتی عمل تک کی متنوع جہات کی ہیئت پذیری کرنے اور اس کے دائرے کو وسیع تر کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہوں۔ یہ بھی درست ہے کہ بظاہر وہ سیدھے سادھے مسلمان اور روایتی حب الوطنی کے جذبے سے سرشار انسان تھے۔ ان کے مذہبی اور بالخصوص اخلاقی تصورات عام فرد کی مانند تھے۔ اسی طرح ۱۹۷۱ء کے سقوطِ ڈھاکہ پر لکھی گئی نظمیں اپنی دردمندی کے باوجود ایک روایتی حب الوطنی ہی کا پرچار کرتی ہیں مگر اس کے باوجود وہ خارجی عوامل سے ایک فرد پر پڑنے والے اثرات کو وسیع تر فکری، کائناتی، فلسفیانہ تناظرات وغیرہ میں دیکھنے اور ان کو نہایت فن کاری اور حسیت سے شعری قالب میں ڈھالنے کا ایسا ہنر رکھتے تھے جو اردو شاعری میں کسی اور کو نصیب نہیں ہوا۔

مجید امجد کے یہاں زر، نظامِ زر یا تصورِ نظامِ زر کو دیکھنے سے پہلے اکیسویں صدی کے نظامِ زر اور کے پس منظر کو جاننا نہایت ضروری ہے کیونکہ اس کو جانے بغیر اس تناظر میں مجید امجد کی شعری تفہیم ممکن نہ ہو پائے گی۔ یہاں یہ اعتراف بھی کرنا ضروری ہے کہ نظامِ زر اور بالخصوص اکیسویں صدی کے نظامِ زر کے بارے میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے اور مسلسل لکھا جا رہا ہے کہ آج بلا مبالغہ سینکڑوں کتابیں اس موضوع پر دستیاب ہیں نیز نظامَ زر اور تصورِ نظامِ زر کے درمیان جو علمی اور عملی تفاوت پایا جاتا ہے اسے بھی مدِ نظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔ لہٰذا ایک مختصر مضمون میں جزوی طور پر اس کا احاطہ کسی طور ممکن نہیں ہے تاہم چند جھلکیاں ضرور دیکھی جا سکتی ہیں۔

اکیسویں صدی کا نظامِ زر، اسی صدی میں زر کی تصور سازی (Conceptualization) کو مبہم تو بناتا ہی ہے مگر اسی مبہم تصور سازی کی تاریخ بھی بیان کرتا ہے یعنی تصورِ زر اسی قدر قدیم اور مبہم ہے جس قدر زر کا وجود البتہ قدیم تاریخ میں اس کا تصور ناپید تھا ! مادیاتی جدلیات (Materialistic Dialecticism) اور تاریخی مادیت (Historical Materialism) اس مبہم تصور کا پہلا سائنسی اور منتظم زمینی تصور بیان کرتی ہے کہ آغازِ زر، اقتصادی زندگی کا آغاز ہے جس کی ہر سطح، ہر پہلو اور ہر دور اپنی کوکھ میں اپنے ہی دور کی قضایا تنسیخ کو پالتا ہے۔ آر تھوڈوکس مارکسی تناظر اس تصورِ زر کا پرچار کرتا ہے، اسلئے اکیسویں صدی کے نظامِ زر کو سمجھنا اور مجید امجد کی شاعری سے اس کا تقابلی جائزہ لینا اسی طور ممکن ہے کہ ہم اس نظام کی عمر کا اعادہ کرتے ہوئے مجید امجد کی شاعری کے تناظر میں اس نظام کی پرتیں کھولتے جائیں۔ اگرچہ بحث کا آغاز مارکس اور اینگلز سے کیا جا رہا ہے مگر یہ مقالہ مارکسیت تک محدود نہیں ہو گا بلکہ مارکسیت اور دوسرے اقتصادی، سماجی، ثقافتی، سیاسی، عقلی اور تعلیمی مفکرین وغیرہ کے زر اور نظامِ زر کے متعلق نظریات کا مختصراً جائزہ لیتے ہوئے اکیسویں صدی کے نظامِ زر تک آئے گا۔ یہاں یہ بتانا بہت ضروری ہے کہ ہم زر بمعنی capital لے رہے ہیں۔

مارکس نے اپنی تصنیف "سرمایہ (The Capital)" کے پہلے والیم میں زر کے نظامِ تغیر کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ زر نہ تو پیسہ (Money) ہے اور نہ ہی جنس (Commodity)، البتہ اپنی استمراریت میں یہ پیسہ اور جنس دونوں ہے جسے وہ ایم سی ایم پرائم ماڈل (M-C-M´) کا نام دیتا ہے[1]۔ اگرچہ اس بنیادی ماڈل کے علاوہ مارکس نے مزید ماڈل بھی تحریر کئے ہیں جو اسی ماڈل کی توسیع ہیں جیسا کہ سرمایہ کے دوسرے والیم میں تحریر کردہ توسیعی ماڈل برائے تغیرِ زر (Extended

(Model of Capital، مگر یہاں مارکس کے ان ماڈلز کی تفصیل سے گریز کیا جائے گا کیونکہ اس مقالے کا مقصد مارکس یا نظامِ زر کا عمیق مطالعہ نہیں ہے۔ یہاں یہ بات مد نظر رہے کہ اس مقالے کا مقصد مجید امجد کی شاعری کے تناظر میں نظامِ زر یا اس نظام کے پہلوؤں کی تصور سازی کرنا ہے نا کہ نظامِ زر کے تناظر میں مجید امجد کی شاعری کا بیان کرنا ہے۔ اس لئے نظام زر کو مختصراً بیان کرتے ہوئے مجید امجد کی شاعری اور اس میں موجود زر کے نظام پر تفصیلاً بحث کی جائے گی اور اس کے ہمراہ جہاں مطالعہ نے سہولت فراہم کی وہاں مجید امجد کی شاعری کو اکیسویں صدی میں صادق آنے والے زر کے نظریات کے ساتھ بیان کیا جائے گا۔

ادب میں زر اپنے منفی پہلوؤں یا منفی اثرات سے متعارف ہوتا ہے جبکہ معاشرتی اور اقتصادی سائنسز میں یہ ایک عمیق اور دقیق تصور ہے جس بنا پر اس تصور کی اب تک کوئی متفق تعریف نہیں ہو سکی۔ ایڈم سمتھ (Adam Smith) اور رکارڈو (Ricardo) کے زر کا تصور مارکس اور اینگلز کے تصور سے مختلف ہے۔ سمتھ کی کتاب "An Inquiry into the Nature and Causes of the Wealth of Nations" 1887 میں شائع ہوئی جس نے اقتصادیات کی جامع اور واضح بنیاد رکھی، سمتھ اس کتاب میں تجویز پیش کرتا ہے کہ ایک قوم کو اپنی تیار کردہ اشیاء دوسرے ممالک کو بیچنی چاہیے مگر ان سے کچھ خریدنا نہیں چاہئے کیونکہ انسانی خوشحالی اپنے ذاتی مفاد کی تکمیل میں ہے اور اگر زر ذاتی مفاد کو آمدن کی مد میں پورا نہیں کرتا تو وہ زر نہیں ہے[۲]۔ زر کی اس تعریف سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک قوم کے لئے جب خوشحالی اور زر کا نظام اس تعریف پر وضع کیا جائے گا تو اس کا اقتصادی رویہ دوسری قوموں کی جانب کیسا ہولناک ہو گا۔ مارکس نے اپنی کتاب سرمایہ کے تیسرے والیم میں بیان کیا ہے کہ زر جمع شدہ مواد اور پیدا کردہ ذرائع پیداوار کا مجموعہ نہیں بلکہ زر وہ ذرائع پیداوار ہیں جو زر کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ اس ضمن میں مارکس کے اپنے الفاظ کچھ یوں ہیں:

> "…capital is not a thing, but rather a definite social production relation, belonging to a definite historical formation of society, which is manifested in a thing and lends this thing a specific social character. Capital is not the sum of the material and produced means of production. Capital is rather the means of production transformed into capital, which in themselves are no more capital than gold or silver in itself is money".(3)

جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زر ایک تجریدی تصور ہے جبکہ اس کے اثرات تجریدیت کی ضد ہیں کیونکہ زر کے تصور کے ساتھ "تصورِ نظام" جڑا ہوا ہے جو اس تصور کو تجریدیت سے دور کرتے ہوئے مادیاتی تناظر میں اس کا اتصال سب سے پہلے مزدور اور منڈی سے کرتا ہے جس کے ساتھ انڈسٹریلائزیشن کا تصور منتھی ہے۔ اسلئے اگر اکیسویں صدی کے مجموعی نظام میں نظامِ زر کا ادراک کرنا ہو تو اس صدی کی انڈسٹری، مزدور اور منڈی کا جائزہ لینا بنیادی جزو ہے۔ مگر اکیسویں صدی میں کسی بھی نظام کا معروضی مشاہدہ، عالمگیریت (Globalization) سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا، یعنی اکیسویں صدی کا نظام، عالمگیریت کا نظام ہے جس میں کوئی بھی جسم اپنا خود مختار یا علیحدہ وجود نہیں رکھتا، اسی سبب نظامِ زر بھی خود مختار، آزاد یا علیحدہ

تصور نہیں ہے۔ اگرچہ ایمانوئیل ڈرخیم اپنی کتاب "Division of Labor" میں معاشرتی نظام کو خود مختار تصور کرتا ہے مگر یہ تصور، نظریے سے زیادہ مابعد الطبیعاتی میلان کا حامل معلوم ہوتا ہے جبکہ اکیسویں صدی، مادیت پسند رجحانات کی صدی ہے جہاں فلسفیانہ علوم اگر روٹی فراہم نہیں کرسکتے تو محض لفاظی ہی رہیں گے۔

عالمگیریت کی تصور سازی کرتے ہوئے جارج رِٹزر (George Ritzer) اپنی کتاب "Globalization" میں بیان کرتا ہے کہ اس نظام میں "وزین یعنی Heavy"، "خفیف یعنی Lighter" میں اور "ٹھوس"، "مائع" میں ڈھلتا جاتا ہے۔[۴] جیسا کہ Paper Money اب Numeric Digits کی صورت اختیار کرچکی ہے یا Bit Coins پیسے کی جگہ لیتے جارہے ہیں۔ مزید بریں، عالمگیریت ثقافتی، سیاسی، سماجی، تعلیمی اور علمی جہات وغیرہ تک پھیلی ہوئی ہے۔ عالمگیریت کے اس تصور کو سمجھنے کے لئے ایمانوئیل والرسٹین (Wallerstein) کی کتاب "The Modern World-System (جدید نظامِ عالم)" کا حوالہ بہت ضروری ہے کیونکہ اس نے کارل مارکس کے پیش کردہ سرمایہ دارانہ نظام میں طبقاتی تصور پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مارکس کا تصورِ سرمایہ دارنہ نظام انیسویں صدی کے سیاسی، معاشی، معاشرتی پہلوؤں وغیرہ میں مقید ہے جبکہ "جدید نظامِ عالم" محض بورژوا اور پرولتاریہ میں منقسم نہیں کیونکہ یہ تصور اٹھارویں اور انیسویں صدی کی انڈسٹری پر ہی صادق آتا ہے ، جبکہ "جدید نظامِ عالم" کے مطابق پوری دنیا "Core یعنی ترقی یافتہ" اور "Periphery یعنی انحصاری" ممالک میں بٹی ہوئی ہے۔[۵] ترقی یافتہ ممالک جیسا کہ امریکہ، فرانس، جرمنی وغیرہ انحصاری ممالک جیسا کہ انڈیا، پاکستان ، بنگلہ دیش وغیرہ کا اقتصادی استحصال (Economic Exploitation) کرتے ہیں یہ نظریہ ، نظریۂ انحصار (Dependency Theory) جسے امریتا سین، آندرے فرینک اور دوسرے بہت سے مفکرین نے تصورِ جدیدیت اور تصورِ ترقی کے خلاف پیش کیا، سے ملتا جلتا ہے۔ انہیں نظریات میں لینن کا تصورِ استعماریت بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔ لینن نے اپنی کتاب "Imperialism: The highest Stage of Capitalism" میں لکھا ہے کہ

> "آزادانہ مقابلہ، سرمایہ دارانہ نظام کا بنیادی جزو ہے۔۔۔ اجارہ داری، آزادنہ مقابلہ کے قطعی معکوس ہے۔۔۔ (اور) ہم مشاہدہ کرچکے ہیں کہ اجارہ داری، آزادانہ مقابلہ کی جگہ لے چکی ہے۔۔۔ اجارہ داری، سرمایہ دارنہ نظام کی اعلیٰ یا اگلی سطح میں منتقلی کا نام ہے۔۔۔ (بلکہ) ہمیں یہ کہنا چاہئے کہ استعماریت، سرمایہ دارانہ نظام کی اجارہ داری والی سطح ہے۔[۶]

مائیکل ہارٹ اور اینتونیو نیگری نے اپنی کتاب "سلطنت The Empire" میں استعماریت پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بیسویں اور اکیسویں صدی میں استعماریت کا تصور صادق نہیں آتا کیونکہ استعماریت سے مراد ایک ملک کا دوسرے ممالک پر جبری تسلط قائم کرنا ہے جبکہ اکیسویں صدی میں ایسا تسلط قائم کرنے والے ممالک کو قومی ریاست (Nation-State) نہیں کہا جاسکتا کیونکہ دوسرے ممالک یا علاقوں پر اپنے قائم کردہ تسلط کے سبب یہ "سلطنت" کا درجہ حاصل کرلیں گے جو تصورِ قومی ریاست سے مختلف ہے کیونکہ قومی ریاست کسی بھی دوسرے علاقے پر جبری تسلط قائم کئے بغیر اپنا وجود قائم رکھتی ہے جبکہ سلطنت کا تصور، جبری تسلط کے بنا ممکن ہی نہیں کیونکہ اس کا اپنا وجود دوسری تمام ریاستوں سے متصل ہے اس

لیے سلطنت، عالمی طاقت ہونے کا نام ہے[۷] جو لینن کے تصورِ استعماریت کے برعکس ہے۔ جس طرح مائیکل ہارٹ اور اینتونیو نیگری، امریکہ کو اس صدی کی سلطنت بتاتے ہیں اس طرح ڈیوڈ ہاروے (David Harvey) نے اپنی کتاب "The New Imperialism" میں امریکہ کو "نواستعماری ریاست" کا لقب دیا ہے[۸] جو تصورِ سلطنت سے تقریباً ملتا جلتا ہے۔

عالمگیریت پر اس مختصر بحث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اکیسویں صدی، "اتصالی مادیت" کی صدی ہے جس میں ہر جزو کو اس کے کل اور ہر کل کو اس کی جزیات سے علیحدہ کر کے مطالعہ نہیں کیا جاسکتا۔ اسی جامع کلیہ کا اطلاق، تصور زر پر بھی صادق آتا ہے جسے اپنے نظام سے جدا کر کے دیکھنا، علمی طور پر تصور سازی کے منطقے کے خلاف ہے۔، اسی سبب پہلے بیان کیا گیا ہے کہ زر، منڈی اور انڈسٹری سے متصل ہے مگر عالمگیریت میں جب زر اپنے نظام میں ڈھلتا ہے تو اس کا بیان سیاسی، سماجی، ثقافتی یا مجموعی نظامِ معاشرت سے اتصال وضع کرتا ہے۔

عالمگیریت کے تناظر میں، زر اپنی حیثیت اپنے اثرات سے واضح کرتا ہے کیونکہ زر اور دولت دو مختلف تصورات ہیں یا یوں کہئے کہ پیسہ، زر اور دولت کی مادی تشکیل کا ایک ذریعہ ہے۔ یہاں تھامس پیکٹی (Thomas Piketty) کی بیسٹ سیلر کتاب، "Capital InTheTwenty-First Century" کا ذکر ضرور کرنا ضروری ہے جو ۲۰۱۳ میں فرانسیسی زبان میں شائع ہوئی اور ۲۰۱۴ میں اس کا انگریزی ترجمہ شائع کیا گیا۔ اسی کتاب کے ایک صدی تک پھیلے ہوئے شماریاتی اور اقتصادی شماریاتی تجزیات سے اخذ کردہ نتائج کی بنا پر پیکٹی کو اس صدی کے کارل مارکس کا خطاب ملا ہے۔

پیکٹی کے نتائج میں سب سے اہم نتیجہ دولت کا ارتکاز ہے جس کے مطابق دولت کی عدم مساوات، آمدنی کی عدم مساوات سے ہمیشہ زیادہ ہوتی ہے اور وہ اپنے تجزیے کی بنیاد پر یہ بھی واضح کرتا ہے کہ جو عدم مساوات بیسویں صدی کے پہلے عشرے میں موجود تھی اکیسویں صدی نا صرف اس کی تقلید ہے بلکہ اسی عدم مساوات کی تقلید جاری بھی رکھے ہوئے ہے۔[۹] کیونکہ پہلی اور دوسری عالمی جنگوں کے دوران دنیا کے اشرافیہ کی دولت میں جو کمی واقع ہوئی تھی وہ اب واقع ہونے کے امکانات نہیں ہیں۔ یہ نتائج اس بنیاد پر حاصل کئے گئے ہیں کہ دوسرے تمام عناصر جو دولت اور آمدنی میں تغیر پر اثر انداز ہوتے ہیں، جامد تصور کئے جائیں۔ ان نتائج کے حصول میں سب سے بنیادی نقطہ زر ہے۔ پیکٹی کے مطابق، زر سے مراد وہ تمام اشیاء ہیں جن سے آمدنی ممکن ہو سکے اس لئے کاروبار، بینک بیلنس، صلاحیتیں وغیرہ زر کی پیداوار کے ذرائع تصور کئے جاسکتے ہیں۔ پیکٹی کے اپنے الفاظ کچھ یوں ہے:

> "…when I speak of "capital" without further qualification, I always exclude what economists often call (unfortunately, to my mind) "human capital," which consists of an individual's labor power, skills, training, and abilities. In this book, capital is defined as the sum total of nonhuman assets that can be owned and exchanged on some market. Capital includes all forms of real property (including residential real estate) as well as financial and professional capital (plants, infrastructure, machinery, patents, and so on) used by firms and government agencies.[10]"

اس تعریف سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کارل مارکس کے تصور زر (جو کہ اقتصادی سرمایہ میں مقید ہے) کے مقابل پیکٹی کے تصورات وسیع تر تناظر کے حامل ہیں اس کی بنیادی وجہ آج کی گلوبل اکانومی کا وہ دائرہ ہے جو بیسویں صدی کے نصف آخر کے بعد بہت تیزی سے پھیلتا ہوا اکیسویں صدی میں انتہائی شکل تک آ پہنچا ہے۔ البتہ اکیسویں صدی میں بھی انسان ایک جنس (Commodity) ہی ہے جس پر بشمول مارکس تمام مفکرین متفق ہیں۔ چند مفکرین انسانی صلاحیتوں کو بھی زر کہتے ہیں۔ مثلاً جی، ایس بیکر (G. S. Becker) انسانی صلاحیتوں کو "انسانی زر یعنی Human Capital" کہتا ہے۔[۱۱] کولمین (Coleman)[۱۲] اور پٹنم (Putnam)[۱۳]، افراد کی دوسروں سے وابستگی اور تعلق کو "سماجی زر یعنی Social Capital" تصور کرتے ہیں۔ پائر بوردیو (Pierre Bourdieu) افراد کے برتاؤ، ڈھنگ، رویے وغیرہ کو "ثقافتی زر یعنی Cultural Capital" کہتا ہے۔[۱۴] انہیں زر کا نام اس لئے دیا جاتا ہے کیونکہ انسانی صلاحیتیں، تعلقات اور برتاؤ، آمدنی پیدا کرنے کے ذرائع ہیں۔ ماحاصل کہ اکیسویں صدی میں تصورِ زر محض اقتصادی نہیں بلکہ افرادی، ثقافتی، سماجی، سیاسی، تعلیمی، عقلی وغیرہ بھی ہے۔ اسلئے، اکیسویں صدی کا نظامِ زر ان تمام پہلوؤں سے منسلک ہے۔ مجید امجد کی شاعری میں نظامِ زر کا تجزیہ انہی تمام پہلوؤں کی روشنی میں کیا جاسکتا ہے۔

مجید امجد کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ نظم کی تخلیق سے پہلے اُس موضوع پر اپنے گہرے مطالعے اور تحقیق کو بروئے کار لایا کرتے تھے۔ اِس ضمن میں میونخ، نہ کوئی سلطنتِ غم ہے نہ اقلیمِ طرب، مقبرہ جہانگیر، ایسی بہت سی نظموں کو مثال کے طور پر پیش کر سکتے ہیں۔ ان کی شاعری سے زر، نظامِ زر اور تصورِ نظامِ زر کے حوالوں سے پہلے اگر ایک نظر ان کی محکمانہ ڈائریوں پر ڈالی جائے تو ان ڈائریوں میں وہ حسابی دنیا کے ایسے گریزاں فرد نظر آتے ہیں جہاں سانس گھٹتے اور نوٹ پستے ہیں۔ ایک نظام میں رہتے ہوئے اس نظام سے گریزاں رویہ ان کے مزاج کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا ہے مجید امجد کسی باقاعدہ نظامِ زر کے نمائندہ یا شارح نہیں تھے تاہم ان کی نظموں میں بل واسطہ یا بلاواسطہ اس کے اشارے ضرور مل جاتے ہیں۔ زر اور نظامِ زر کے حوالے سے رائج نقطہ ہائے نظر میں زیادہ تر اہمیت طبقات کی تقسیم کے حوالے سے کی گئی ہے مارکس ان طبقات کی تقسیم معاشی بنیادوں پر کرتا ہے جو بورژوا اور پرولتایہ کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ تصور انیسویں صدی کی صورتِ حال میں وضع کیا گیا تھا تاہم بیسویں صدی کے آغاز پر میکس وِیبر (Max Weber) نے ان طبقات کی تقسیم کی بنیاد معاش کے بجائے رتبے (states) پر رکھی جس کے لیے اس نے جرمن اصطلاح ستناندے (stande) کا استعمال کیا ہے۔ وِیبر اپنے شہرہ آفاق مضمون The Distribution of Power within the Community: Classes, Stande, Parties. میں لکھتا ہے کہ طبقے بے شک پیسے کی بنیاد پر قائم ہوں مگر اُن کا تعین اُن کے رُتبے (states) اور رویے کی بنیاد پر ہو گا۔[۱۵] اسی طرح پائر بوردیو ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے مارکس کی معاشی اور وِیبر کی رُتبے کی بنیاد کو یکساں اہمیت دیتا ہے۔ وہ اپنی کتاب The Distinction 1984 میں اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے کہ ثقافتی زر کے لیے معاشی زر کا ہونا بہت ضروری ہے کیونکہ معاشی زر ہو گا تو یہ ثقافتی زر کا تعین کر سکے گا اور یہی ثقافتی زر طبقے کا تعین کرتا ہے۔ اپنی تھیوری Social and Cultural Reproduction میں وہ بیان کرتا

ہے کہ اس نظامِ زر میں امیر طبقے کا فرد عموماً امیر طبقے ہی میں رہے گا جبکہ غریب طبقے کے فرد کا تعین غریب طبقے ہی سے کیا جائے گا نیز ذوق (Taste) ایک ایسا عنصر ہے جو اس تقسیم کردہ طبقے کا تعین کرتا ہے۔ یہ تعین اشیائے صرف سے لے کر زبان اور طرزِ زندگی تک کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ مجید امجد کے یہاں بھی بعض نظموں میں نظامِ ثقافت زر کی مختلف شکلیں نظر آتی ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی نظم پنواڑی اس حوالے سے اہمیت کی حامل ہے جہاں اس نظامِ زر کے چیرہ دستیوں کے سبب ایک لوئر کلاس کی پوری نسل اگلی لوئر کلاس میں ڈھل جاتی ہے اور یہ سلسلہ نسل در نسل اسی طرح جاری ہے جو بالواسطہ طور پر اس نظامِ زر کو قائم رکھے ہوئے ہے۔

بوڑھا پنواڑی اس کے بالوں میں مانگ ہے نیاری
آنکھوں میں جیون کی بجھتی اگنی کی چمگاری
نام کی ایک ہٹی کے اندر بوسیدہ الماری
آگے پیتل کے تختے پر اس کی دنیا ساری
پان، کتھا، سگرٹ، تمباکو، چونا، لونگ، سپاری
کون اس گتھی کو سلجھائے، دنیا ایک پہیلی
دو دن ایک پھٹی چادر میں
دکھ کی آندھی جھیلی
دو کڑوی سانسیں لیں، دو
چلموں کی راکھ انڈیلی
اور پھر اس کے بعد نہ پوچھو، کھیل ج ہونی کھیلی
پنواڑی کی ارتھی اٹھی، بابا اللہ پیلی
صبح بھجن کی تان منوہر جھنن جھنن لہرائے
ایک چتا کی راکھ ہوا کے جھونکوں میں کھو جائے
شام کو اس کا کم سن بالا بیٹھا پان لگائے
جھن جھن ٹھن ٹھن چونے والی کٹوری بجتی جائے
ایک پتنگا دیپک پر جل جائے دوسرا آئے

(پنواڑی مشمولہ کلیات مجید امجد مرتبہ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، لاہور، ماورا پبلی کیشنز، بار اول۔ ۱۹۸۹، ص ۱۶۷-۱۶۸)

اسی طرح طلوعِ فرض (ص:۱۴۸)، جاروب کش (ص:۳۰۳)، ہڑپے کا ایک کتبہ (ص:۳۲۱)، جیون دیس (ص:۳۲۴)، پھولوں کی پلٹن (ص:۴۸۳)، میٹنگ (ص:۵۰۶)، موٹر ڈیلرز (ص:۵۶۸) ایسی نظمیں ہیں جو نظامِ ثقافتِ زر کی جھلکیاں پیش کرتی ہیں۔ جہاں تک معاشی یا اقتصادی زر کا تعلق ہے مارکس اور پیکٹی نے اس پہلو سے قابل قدر

بحث کی ہے۔ جس کا تفصیلی ذکر گزشتہ صفحات میں آ چکا ہے۔ اردو میں مارکس کے معاشی تصورات کے زیر اثر ترقی پسند تحریک نے طبقاتی شعور، قدرِ زائد اور اس کے اثرات، زر کی غیر منصفانہ تقسیم، انقلاب اور سماج کے حوالے سے پروگریسو نقطہ نظر وضع کیا جسے اردو ادب میں بے پناہ پذیرائی ملی تاہم مجید امجد سماجی اور معاشرتی تناظر میں ان تصورات کی فلسفیانہ تعبیر کی بجائے اس کی ادبی اثر پذیری سے متاثر ہوئے۔ کلیات میں ایسی نظموں کی شمولیت اسی اثر پذیری کے تحت ہے۔ درسِ ایام اور کہانی ایک ملک کی ایسی نظمیں اسی اثر پذیری کا نتیجہ ہیں:

سیلِ زماں کے ایک تھپیڑے کی دیر ہے
یہ ہات، جھریوں بھرے، مرجھائے ہات جو
سینوں میں اٹکے تیروں سے رِستے لہو کے جام
بھر بھر کے دے رہے ہیں تمھارے غرور کو
یہ ہات گلبنِ غمِ ہستی کی ٹہنیاں
اے کاش انہیں بہار کا بھونکا نصیب ہو
ممکن نہیں کہ ان کی گرفتِ تپاں سے تم
تادیر اپنی ساعدِ نازک بچا سکو
تم نے فصیل قصر کے رخنوں میں بھر تو لیں
ہم بے کسوں کی ہڈیاں لیکن یہ جان لو
اے وارثانِ طرۂ طرفِ کلاہ کے
سیلِ زماں کے ایک تھپیڑے کی دیر ہے
(درس ایام مشمولہ کلیات مجید امجد، ص ۲۲۷)

راج محل کے اندر اک اک رتناسن پر
کوڑھی جسم اور نوری جامے
روگی ذہن اور گردوں پیچ عمامے
جہل بھرے علامے
ماجھے، گامے
بیٹھے ہیں اپنی مٹھی میں تھامے
ہم مظلوموں کی تقدیروں کے ہنگامے
جیبھ پہ شہد۔ اور جیب میں چاقو
نسل ہلاکو

راج محل کے باہر، سوچ میں ڈوبے شہر اور گاؤں
یل کی انی، فولاد کے پنجے
گھومتے پہیے، کڑیل باہیں
کتنے لوگ، کہ جن کی روحوں کو سندیسے بھیجیں
سکھ کی سیجیں
لیکن جوہر راحت کو ٹھکرائیں
آگ پیئں اور پھول کھلائیں (کہانی ایک ملک کی مشمولہ کلیات مجید امجد، ص۲۸۵-۲۸۶)

اکیسویں صدی کے جدید نظام زر میں سماجی / معاشرتی زر کو بھی نظامِ زر کا اہم حصہ مانا جاتا ہے۔ اس ضمن میں پٹنم (Putnam) کی کتاب Bowling Alone سماجی زر (social capital) کی تفہیم کے حوالے سے اہم کتاب ہے۔ معاشرتی تعلقات کو سماجی زر اس لیے گنا جاتا ہے کہ کہ یہاں انسانی تعلقات زر کے حصول میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ کتاب میں امریکی معاشرے میں کم ہوتی انسانی وابستگیوں کو بطور استعارہ دکھایا گیا ہے جس کے نتیجے میں سماجی زر میں تیزی سے کمی واقع ہو رہی ہے تاہم اس کتاب سے اکیسویں صدی کی گلوبل صورت حال کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ اسی طرح جدید نظامِ زر کا ایک پہلو انسانی زر یا Human Capital کا بھی ہے جس کی رُو سے انسانی صلاحیتیں حصولِ زر میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ جیسا کہ مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے لوگ جو اپنی جسمانی، ذہنی اور تخلیقی صلاحیتوں کے بدلے زر کو ممکن بناتے ہیں۔ مجید امجد کی شاعری میں سماجی اور انسانی زر کے جدید تصورات کی جھلکیاں واضح طور پر نظر آتی ہیں۔ وہ جس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں وہاں موجود لوگوں کے سماجی رشتے، ان رشتوں کی غرض مندیاں، معاشرے کے کردار، اور مختلف ان کرداروں کی صلاحیتوں کو مجید امجد نے اپنے عمیق مشاہدے کے ذریعے دیکھا اور پرکھا ہے۔ اس حوالے سے شاعر (ص:۷۳)، جہانِ قیصر و جم میں (ص:۱۹۸)، نرگس (ص:۲۷۹)، بھکارن (ص:۲۸۳)، برہنہ (ص:۳۰۱)، بارکش (ص:۳۸۱)، حربے (ص:۳۸۹)، جلوسِ جہاں (ص:۴۱۶)، ایک فلم دیکھ کر (ص:۴۲۱)، گداگر (ص:۵۷۵)، دلوں کے ان فولادی (ص:۶۴۳) وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جو اس نظام زر کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرتی ہیں۔

قریب آ ، یہ بدن ، میری زندگی کا طلسم
تری نگاہ کی چنگاریوں کا پیاسا ہے
جو تُو کہے تو یہی نرم لہریا آنچل
یہی نقاب مری چٹکیوں میں اٹکی ہوئی
یہی ادا مری انگڑائیوں سے مسلی ہوئی
یہ آبشار ڈھلانوں سے گر بھی سکتی ہے

بس ایک شرط --یہ گوہر سطور دستاویز
ذرا کوئی یہ وثیقہ رقم کرے تو سہی
اکائیوں کے اُدھر جتنے دائرے ہوں گے
اِدھر بھی اتنے ہی عکس ان برہنہ شعلوں کے
(ایکٹریس کا کنٹریکٹ مشمولہ کلیات مجید امجد، ص ۴۰۵)

اکیسویں صدی کے نظامِ زر کے یہ مختلف الجہات پہلو ایک مکمل اور مربوط نظام کی خبر دیتے ہیں جہاں گلوبل اکانومی دیگر نظام ہائے فکر کے ساتھ خود کو مربوط کرتی ہے اور ایک منظم اکائی کے طور پر اس کُل سے اتصال کرتی ہے جو ہمہ جہت اور تغیر پذیر ہے۔ اس تناظر میں مجید امجد کی شاعری کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اُن کے یہاں نظامِ زر اصولی اور نظری بنیادوں سے زیادہ اس نظام کے نتیجے میں ابھرنے والے اثرات کو زیر بحث لاتا ہے۔ مجید امجد بیسویں صدی سے متعلق ہیں اور ان کی زندگی میں نمایاں ہونے والی فکر مارکسی تھی جو ترقی پسند تحریک کے تحت علمی اور ادبی حلقوں میں معروف ہوئی تاہم وہ اور ان کی شاعری اس کے نظریاتی اثرات سے بہت حد تک گریزاں رہی جس کی بنیادی وجہ صورتِ معنی اور معنی صورت کا وہ الجھاوا تھا جس نے انہیں تخلیق کی کاوشِ پیہم سے دو چار رکھا۔ اس کے علاوہ ان کا مزاج، شعری رویہ اجتہادی ہونے کے ناتے نظم کی خارجی ساخت سے زیادہ داخلی واردات سے متعلق رہا۔ وہ جس زماں اور مکاں میں تھے اور اس عہد میں جو بھی نظام رائج رہا اسی کا شاخسانہ آج اس کی گلوبل شکل میں موجود ہے۔ ویسے بھی ایک شاعر کا جزوی یا کلی انحراف اپنی جگہ ان عوامل کے دوہرے اثرات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مجید امجد کی شخصیت اور شاعری پر اپنے عہد کے نظام زر کے اثرات کو منفی و مثبت کے خانوں میں تقسیم نہیں کرنا چاہیے بلکہ اسے ایک تخلیقی واردات سے تعبیر کرنا چاہئے کیونکہ ان کی تخلیقی شخصیت محض ان اثرات تک محدود نہیں رہی بلکہ یہ اثرات ان کے دیگر موضوعات کے لیے عمل انگیز کا کام کرتے نظر آتے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی مد نظر رکھنے چاہئے کہ نظام زر کے حوالے سے اثر پذیری کا رویہ اس نظام اور اس کے غیر انسانی، غیر تخلیقی اور زر مرتکز رویے کے سبب ہی متاثر نہیں کرتا بلکہ اس بے حس نظام کے مقابل غیر شعوری طور پر ایک فکری رویے کو جنم دیتا ہے۔

مجید امجد کی شاعری پر نظامِ زر کے حوالے سے ابھرنے والا پہلا رویہ غم اور احساس غم کا ہے۔ ادب میں غم / دکھ زندگی کی تہذیب، شخصیت کے سبھاؤ، اور جذبے کی آنچ سے عبارت ہے جو زندگی کو بحیثیت کُل اپنے سرمایے سے تخلیق کار کو لفظ دان کرتا ہے۔ غم کی یہ تہذیب ہماری شعری روایت کا مضبوط اور ہمہ گیر موضوع ہے تاہم نظامِ زر کے حوالے سے مجید کے یہاں غم ایک پہلو سے تلخ نوائی کا سبب بھی بنتا ہے جو زندگی سے جڑے حوالوں میں یکساں طور پر سنائی اور دکھائی دیتا ہے۔ کلیات میں پہلی اہم نظم یہی دنیا ہے (ص ۵۹) طنز اور گلے کے ملے جلے احساس کی حامل یہ نظم شاعر کو اپنی ذات سے باہر جھانکنے روٹی کو ترستے سیہ قسمت غلاموں کو سیم و زر کے دیوتاؤں کے دست نگر دیکھتا ہے۔ ابتدائی نظموں کی نوخیز واردات سے ہٹ کر کنواں، طلوع فرض اور پنواڑی جیسی تہہ دار نظمیں غم کو کائناتی قالب میں دیکھنے کی کوشش ہے۔ نظام زر کی بے

رحمی سے متاثرہ نظموں کی ایک طویل فہرست ہے جو آغاز سے لے کر ان کے آخری دور تک کی شاعری کو متاثر کرتی ہے۔ آج اکیسویں صدی کے بڑے المیوں کا جائزہ لیں تو ان میں ایک المیہ غم کی کی قدر کے آفاقی ہونے کی بجائے قنوطی شکل میں سامنے آیا ہے۔ عالمی حصول مسرت کے انڈیس کا جائزہ لیں تو دنیا کے بیشتر ترقی پذیر ممالک اس انڈیس کے نچلے درجوں میں ہی جگہ بنا پائے ہیں جو اس بات کی وضاحت ہے کہ اس نظامِ زر کے ہاتھوں انسانی خوشیوں میں کمی واقع ہوتی جارہی ہے۔ مجید امجد اسی المیہ کا اظہار کرتے ہیں:

تُو اگر چاہے تو ان تلخ و سیہ راہوں پر
جابجا ، نئی تڑپتی ہوئی دنیاؤں میں
اتنے غم بکھرے پڑے ہیں کہ جنھیں تیری حیات
قوتِ یک شب کے تقدس میں سمو سکتی ہے
کاش، تو حیلہِ جاورب کے پَر نوچ سکے
کاش تو سوچ سکے سوچ سکے

(جاروب کش مشمولہ کلیات مجید امجد، ص ۳۰۴)

آسمان سے لے کر سطحِ زمیں تک ہر سو پھیل گئی ہیں۔۔لاکھ خراشیں
دکھتی خراشیں، گہری، الجھی ہوئی لہریلی
پگھلی ہوئی بے جسم سلاخیں، پتلی پتلی، پیلی پیلی
دیکھ اب ان سیال سلاخوں کی چمکیلی باڑ پہ جتنے پھول ہیں، ان کو توڑ کے لے گئے جھونکے
اور اب باقی صرف ایک سرد سیاہ الجھاؤ

(ایک شام مشمولہ کلیات مجید امجد، ص ۴۰۲)

مجید امجد کی تخلیقی شخصیت پر نظامِ زر کا ایک اثر فرد کی تنہائی اور بیگانگی کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ ان کی زندگی کے احوال جاننے والے جانتے ہیں کہ اپنی نجی زندگی میں وہ جن حالات سے بچپن سے آخری عمر تک دوچار رہے ان واقعات نے مجید امجد کے اندر عدم تحفظ، ذات مرتکز اور وجودی طرز کے رویوں کو پنپنے کا موقع فراہم کیا۔ وہ مردم بیزار تو نہیں تھے بڑی سے بڑی تکلیف میں بھی مگر اپنے دل کی حال کسی سے نہیں کہتے تھے۔ سادہ لفظوں میں کہا جائے تو وہ تنہائی اور کسی حد تک بیگانگی کا شکار تھے۔ یہ احساس ذاتی بھی تھا اور سماج کے ایک فرد کا بھی جو بڑی حد تک معاشی اور معاشرتی صورتِ حال کا منطقی نتیجہ بنتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ فرد کی منافقت، خود غرضی، بے بسی اور دوغلے پن کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ ان رویوں کا براہ راست تعلق سماجی نظام کی کلیت سے ہے جو انسان کو خود آسودگی کے دائرے تک محدود رکھتی ہے۔

یہ لطفِ کریمانہِ خوشدلاں بھی، یہ پُر غیظ خوئے سگاں بھی

مرے ساتھ رَو میں ہیں لوگوں کے جتنے رویے، یہ سب کچھ، یہ سارے قضیے
غرض مندیاں ہی غرض مندیاں ہیں، یہی کچھ ہے اس رہگزر پر متاع، سواراں
میں پیدل ہوں مجھ کو جلوس جہاں سے انھی ٹھوکروں کی روایت ملی ہے
(جلوس جہاں مشمولہ کلیات مجید امجد، ص۴۱۶)

اتنے بڑے نظام میں صرف اک میری ہی نیکی سے کیا ہوتا ہے
میں تو اس زیادہ کر بھی کیا سکتا ہوں
میز پر اپنی ساری دنیا
کاغذ اور قلم اور ٹوٹی پھوٹی نظمیں (فرد مشمولہ کلیات مجید امجد، ص۴۷۰)

جن لفظوں میں ہمارے دلوں کی بعیتیں ہیں، کیا صرف وہ لفظ ہمارے کچھ بھی نہ کرنے کا کفارہ بن سکتے ہیں
کیا کچھ چیختے معنوں والی سطریں سہارا بن سکتی ہیں ان کا
جن کی آنکھوں میں اس دیس کی حد ان ویراں صحنوں تک ہے
کیا یہ شعر اور کیا ان کی حقیقت
ناصاحب، اس اپنے لفظوں بھرے کنستر سے چلّو بھر کر بھیک کسی کو دے کر
ہم سے اپنے قرض نہیں اتریں گے (جن لفظوں میں۔۔ مشمولہ کلیات مجید امجد۔ ص۶۹۳)

نظامِ زر کے رونما ہونے والے اثرات کا دائرہ بہت وسیع ہے، میکانکیت، مشینی جمالیات، ماضی گریز رویہ، فنا، آگہی کی بھیک اور اس انداز کے بہت سے پہلو ان کی شاعری سے با آسانی تلاش کیے جاسکتے ہیں اور ان کا تفصیلی تجزیہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ موضوعاتی اثر پذیری کے علاوہ وہ لفظیات، تراکیب، مرکبات اور تمثالوں کے ذریعے بھی ان اثرات کا اظہار کرتے ہیں مثلاً بل کھاتے ضمیر، کھانستی صدیاں، لوہے کی گردن، کاٹھ کی روحیں، لفظوں بھرا کنستر، ہڈیوں کا گرم گارا، روحوں کے عفریت کدے، ریڑھ کی نلکی، سونے کا گودا، دکھی ریکھائیں، کنگرہِ ماہ و سال، نشیبِ زینہِ ایام، یخ کدہِ یقینِ غم اور اس طرح کی سینکڑوں مثال دی جاسکتی ہیں۔

مجید امجد نے انسانی اور شاعرانہ سطح پر اپنے عہد اور سماج کو دیکھا ہے۔ ان کے یہاں مروجہ نظامِ زر اور اس کے تلخ اثرات بھی بیان کیے گئے ہیں تاہم وہ اس نظامِ زر کے متوازی اپنا ایک شاعرانہ نظام سے بالواسطہ پرچار کرتے نظر آتے ہیں۔ اپنی زندگی کے آخری انٹرویو میں یوسف کامران کے ایک سوال کے جواب میں انھوں نے زندگی کو عملِ خیر کا تسلسل قرار دیتے ہوئے کہا تھا کہ:

"میں اس کو اپنا شخصی رویہ کہوں گا جو میرے ذہن میں ایک رو کی طرح ہمیشہ موجود رہا ہے، ایک تسلسل کی طرح ہمیشہ میری زندگی کے ساتھ رہا ہے۔ میں اس کے تابع ہو کر تمام مضامین کو، جو میں زندگی کی حقیقتوں میں دیکھتا ہوں، میں نے اس کے تابع رہ کر شعر کہا ہے۔ میرے

ہاں یہ نظریہ ہے، میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ تمام ممالک میں، تمام کائنات میں، تمام تاریخ میں، تمام ارتقا میں ایک چیز مسلسل زندہ رہی ہے اور وہ عمل خیر کا تسلسل ہے۔ اس عمل خیر کے تسلسل کو جاری رکھنا ہر دور میں انسان کا فرض رہا ہے، ہر لحاظ سے فرض رہا ہے۔ اس دور میں بھی ضروری ہے اور کون اس کے لیے ریاضت کر سکتا ہے، کون اس کے لیے مجاہدہ کر سکتا ہے، لیکن جتنا اس کے لیے کوشش ہو سکے۔ میں نے ان واقعات کو اس طرح بیان کیا کہ پڑھنے والا ان میں ان مسرتوں کو حاصل کرے یا اس سے متاثر ہو ۔۔۔۔ تاکہ انسانی زندگی سچی مسرتوں سے لبریز ہو جائے جس کے لیے کائنات پیدا کی گئی ہے اور وہ لمحات ہمیشہ آتے ہیں، انسانوں کی زندگیوں میں، قوموں کی زندگیوں میں، ایک دن میں متعدد بار آتے ہیں۔ اس کے لیے کون کوشش کرتا ہے میں ان لوگوں کی تلاش میں ہوں۔ (۱۶)

مندرجہ بالا اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عملِ خیر کا تسلسل مجید امجد کی پوری شاعری کی روحِ اصل ہے اور وہ متبادل نظام ہے۔ یہ نظام اپنے ظاہر میں اخلاقیاتی تصور لیے ہوئے ہے مگر اپنے داخل میں یہ ایک ایسی کلی حقیقت ہے جو انسانی زندگی کو حسن، ترتیب، خوشی اور آسودگی ایسی اقدار سے روشناس کروا سکتی ہے۔ مجید امجد کی شاعری، فکر اور فن سے اختلاف کیا جا سکتا ہے یہاں تک کہ کڑے پیمانے پر جانچ بھی کی جا سکتی ہے مگر ان کی شاعری میں عمل خیر کا تسلسل روح کی طرح سرایت کیے ہوئے ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ مجید امجد کی پوری شاعری عمل خیر اور اس کے تسلسل ہی ہے تو یہ دعوی غلط نہیں ہو گا۔ اکیسویں صدی کے نظام ہائے زر کی بے رحمی، مفاد پرستی، غرض مندی اور سفاکی جس غیر انسانی صورتِ حال سے دوچار کرتی ہے اس کا مداوا مجید امجد کی شعری کائنات میں کیا جا سکتا ہے۔ اس عمل خیر کا تسلسل بھی ہمہ گیر اور آفاقی ہے۔ فطرت سے فرد کے ٹوٹے ہوئے تعلق کا از سرے نو اعادہ، نئے انسان کی دریافت، تناظر کی وسعت، اور ہمدردی اس عمل خیر کے بنیادی اجزا ہیں۔ یہ تمام اجزا تفصیلی مطالعہ کے متقاضی ہیں جو یہاں ممکن نہیں تاہم آج کے نظامِ زر کے مقابلے میں مجید امجد کے عملِ خیر کا تسلسل اکیسویں صدی کو زیادہ محفوظ، خوشحال اور پُرامن بنانے کی ضمانت دے سکتا ہے۔

حوالہ جات

1. Marx, K. (1887, p. 102). *Capital: A critique of political economy, Volume I Book One: The Process of Production of Capital*. Progress publishers.
2. Smith, A. (1887). *An Inquiry Into the Nature and Causes of the Wealth of Nations*... T. Nelson and Sons.
3. Marx, K. ([1959] 1999). *Capital: A Critique of Political Economy. Volume III... The Process of Capitalist Production as a Whole*. Progress Publishers.
4. Ritzer, G. (2011, p. 3-8). *Globalization: The essentials*. Willey-Blackwell.
5. Wallerstein, I. ([1974] 2011). *The Modern World-System I: Capitalist Agriculture and the Origins of the European World-Economy in the*

Sixteen Century. University of California Press. [For further review see, vol. II to IV]

6. Lenin, V. I. (1999, p. 91). *Imperialism: The highest Stage of Capitalism*. Sydney: Resistance Books
7. Hardt, M. &Negri, A. (2000). *Empire*. Cambridge, MA: Harvard University Press.
8. Harvey, D. (2003). *The New Imperialism*. Oxford: Oxford University Press.
9. Piketty, T. (2014, p. 24-25). *Capital in the Twenty-First Century.* The Belknap Press of Harvard University Press.
10. *Ibid*, p. 38. غور طلب بات یہ ہے کہ پیکٹی نے اس تعریف میں انسانی زر کو شامل نہیں کیا اور وہ اس کی کافی وجوہات بیان بھی کرتا ہے مثلاً انسانی زر کو زر کی تعریف میں شامل نہ کرنے کا سب سے واضح سبب جو پیکٹی نے بیان کیا وہ یہ ہے کہ اس زر کو نہ تو مارکیٹ میں بطور تجارت استعمال کی جا سکتا ہے اور نہ ہی اسے کوئی دوسرا شخص اپنی ملکیت بنا سکتا ہے۔
11. Becker, G. S. (1964). *Human capital theory.* Columbia, New York.
12. Coleman, J. S. (1988). Social capital in the creation of human capital. *American journal of sociology, 94,* S95-S120.
13. Putnam, D. D. (2000). *Bowling Alone: The Collapse and Revival of American Community*. New York, NY: Simon and Schuster.
14. Bourdieu, P. (1986). Forms of Capital. In S. Ball (Eds.), *The RoutledgeFalmer Reader in sociology of education* (pp. 15-29). RoutledgeFalmer. بوردیو کے حوالے کے ہمراہ یہ بیان کرنا بھی بہت ضروری ہے کہ اس نے بھی سماجی زر کو اپنے نظریے میں شامل کیا ہے مگر اس کے ہاں سماجی زر، پٹنم اور کولمین کے متعارف کردہ زر سے مختلف ہے۔ بوردیو صرف انہی سماجی وابستگیوں اور تعلقات کو سماجی زر تصور کرتا ہے جو مستحکم ہوں یا جن میں پیداواری صلاحیتوں کا وسیع تر امکان موجود ہو یعنی وہ تعلقات جو جمع شدہ زر اور ان کی اقسام میں مزید اضافہ یا پھر اسی زر میں ٹھہراؤ کے لئے بطور وسائل و زرائع استعمال نہ ہوں وہ سماجی زر تصور نہیں ہوں گے۔ اس کے برعکس، کولمین اور پٹنم کے وضع کردہ تصور میں تمام سماجی وابستگیاں، سماجی زر ہیں۔
15. Weber, M. (1978).*Economy and society: An outline of interpretive sociology*. University of California Press.

۱۶۔ مجید امجد سے ایک انٹرویو، انٹرویو نگار یوسف کامران، پاکستان ٹیلی ویژن، لاہور سینٹر، ۱۹۷۳، مزید تفصیل جاننے کے لئے دیکھیے https://www.youtube.com/watch?v=JaHHWAttGHM